تعمیرِ حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۱۴ | ۲۵ جون ۱۹۷۷ء ——— ۲۲ رجب ۱۳۹۷ھ | شمارہ نمبر ۱۷

زرِ تعاون اندرونِ ہند مع محصول ڈاک:
سالانہ ۱۲ روپے ششماہی سات روپے
فی پرچہ ۵۰ پیسے
بیرونِ ہند مع محصول ڈاک:
بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ سٹرلنگ
ہوائی ڈاک سے: امریکہ، کناڈا اور
یورپین ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے ممالک: ۲ ½ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپے
بنگلہ دیش: ۱۵ روپے

مکتوبِ امریکہ

زیرِ نظر شمارہ مکمل ہو چکا تھا اور طباعت کے لئے پریس بھیجنے میں چند گھنٹے باقی تھے کہ امریکہ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے رفیقِ سفر مولانا محمد رابع صاحب ندوی کا مکتوبِ گرامی بنام مولانا واضح رشید ندوی و مولانا محمد الحسنی موصول ہوا، ادارہ نے کتابت روک کر اس معلومات افزا مکتوب کو اداریہ کے صفحہ پر افادۂ عام کی غرض سے شائع کیا جا رہا ہے۔

AHMAD M. SIDDIQI, M. D.
NADWA
98 CONKLIN AVE.
WOODMERE, L. I., N. Y. 11598 U.S.A
TELEPHONE (516) [illegible]

عزیزی واضح سلمہ، و عزیزی محمد میاں سلمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے، ہم لوگوں کے بخیریت نیویارک پہنچنے کا تار آپ سب کو مل چکا ہوگا۔ ہمارا یہ سفر سب پروگرام حسبِ ضرورت کچھ وقت سے شروع ہوا اور اندازہ یہ تھا کہ جہاز جدہ سے رات میں چل کر دوسرے دن صبح کو نیویارک پہنچ سکے گا، دس بارہ گھنٹے ہوئے لیکن اس میں ۹ ½ گھنٹے ملا کر وقت کا صحیح حساب بنتا ہے کیونکہ ہندوستان کے مقابلہ امریکہ کے مشرق میں سورج ۹ ½ گھنٹے بعد نکلتا ہے، لیکن ہوا یہ کہ جہاز اپنی مشینی یا انتظامی کسی دشواری کی بنا پر ۶ گھنٹے دہلی ایرپورٹ پر لیٹ ہوا اور سب مسافروں کے دن و سہ پہر گزار دیا اور پھر جہاز اس نے بمبئی کو [illegible] جانے کا اعلان کیا، بمبئی میں مزید دو گھنٹے ٹھہرا، پھر ہم لوگ ہندوستان سے تقریباً ۹ ½ گھنٹے لیٹ نکلے جس کے نتیجہ میں نیویارک رات کے ۱۲ ½ بجے پہنچے اور قیام گاہ تک پہنچتے ۲ ½ بج گیا، جس کو ہندوستانی وقت کے اعتبار سے دوسرے دن کے ۱۱-۱۲ بجے کہنا چاہئے، اس طرح یہ سفر کوئی ۳۰ گھنٹے صرف ہوئے، اس قدر طویل اور مسلسل سفر [illegible] ہوائی جہاز سے کیا [illegible] تمام صحت قائم رہا، لیکن خدا کا بہت بڑا شکر ہے اطمینان اور صحت کے ساتھ نیویارک پہنچے، نیویارک میں جانے والے [illegible] لیکن اگر معلوم نہ تھا، البتہ سید ہدایت حسین صاحب کے صاحبزادہ سید ساجد حسین صاحب [illegible] منتظر تھے، جہاز کے لیٹ ہو جانے کے باعث خود تو ہوائی اڈہ پر نہ پہنچ سکے لیکن اپنے ایک دوست کو [illegible] بھیجا [illegible] انڈیانا پولس کے لئے ہوائی جہاز [illegible] انڈیانا پولس نیویارک سے جانب غرب تقریباً [illegible] سو میل کے فاصلہ پر [illegible] واشنگٹن [illegible] نیویارک سے انڈیانا پولس تک ہوائی جہاز سے [illegible] واشنگٹن [illegible] انڈیانا پولس ریاست انڈیانا [illegible] یونیورسٹی [illegible] مسلم طلبہ [illegible] یونیورسٹیوں [illegible]

[illegible] وکانات سے جی ہوئے اور ان کے افادہ کے لئے عالمِ اسلام کی متعدد ذی علم اور مشہور شخصیتوں کو بھی مدعو کیا گیا، چنانچہ ان مدعوین میں استاد یوسف القرضاوی، شیخ عبد اللہ ترکی، شیخ محمد المبارک، [illegible] پروفیسر خورشید احمد اور متعدد اہلِ علم تھے۔ یہاں یہ بات [illegible] کہ ایک غیر مسلم یونیورسٹی نے مسلمانوں کے لئے رواداری دکھائی کہ انکے اجتماع کو اپنی عمارتوں میں اس طرح جگہ دی جیسے کوئی مسلم یونیورسٹی دیتی ہے، معلوم ہوا کہ یہاں کا ایک معمول سا ہے کہ اساتذہ یونیورسٹی کے طالب علموں کو ایسے کاموں کے لئے مستعار لے لیتے ہیں۔

[illegible] میں عرب، ہندوستانی، پاکستانی اور ایشیائی و افریقی مسلمانوں کا وجود انکا بھی ایسی فضا پیدا کر رہا تھا کہ گویا یہ شہر عالمِ اسلام ہی کا کوئی شہر ہے، دولت اور وسائلِ زندگی کی ترقی کے امریکی مظاہر ایک حد تک اب تبدیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں کے بڑے شہروں میں بھی ملنے لگے ہیں۔ اور اس میں جب اس بات کو شامل کر لیا جائے کہ صبح سے شام تک جتنا دولت کا [illegible] زیادہ تر ہم لوگوں کو ملتا ہے وہ مشرق یا عرب کے تمدن کی [illegible] ملکی عزیز حالت نظر آنے لگتا تو کوئی تعجب کی بات نہیں، یوں تو ظاہر ہے کہ امریکی تمدن و وسائلِ زندگی کی کثرت اور معیار کی بلندی میں بہت آگے جا چکا ہے حتی کہ اب یورپ بھی اس سے پیچھے ہے، یہ زندگی کے مظاہر اور وسائل کو ترقی دیکر اپنی دنیا کو مصنوعی جنت بنانے کی ایک کوشش ہے جس میں پیدا وار اور مادی طاقت سے زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ [illegible] انسان کو جسمانی محنت سے بڑی حد تک مستغنی بنا دیا گیا ہے، اکثر کام مشین دبا کر انجام دے لئے جاتے ہیں جس جیسے ہوتے جا رہے ہیں بجلی فون کو عام اور ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔

امریکی زندگی پر یہود کا غلبہ سب سے زیادہ ہے، ملک کی [illegible] فیصد دولت پر یہود کا قبضہ ہے اس کی مدد سے ملک کی سیاست اور اس کے قائدین کو انہوں نے اپنی مرضی کا تابع بنا رکھا ہے، عوام اگرچہ ان کو زیادہ پسند نہیں کرتے لیکن ملک کے کلیدی اختیارات پر ان کا کنٹرول ہے لہذا ان کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا، اطبا اور اہلِ قانون میں بھی ان کا اوسط بہت غیر معمولی ہے، ایک صاحب بتانے لگے کہ کسی طبیب یا وکیل کے مذہب کے بارے میں اگر معلوم نہ ہو تو احتیاطاً یہودی ہی سمجھنا چاہئے، حکومت قانون کی مشنری میں ہے، کوئی قانون انکے مفادات کے خلاف نہیں بن سکتا، کوئی سیاست ان کی مرضی کے برعکس نہیں چل سکتی، یہود کا اصلی اوسط نیویارک ہیں، اس کے بعد مشرقی اور وسطی امریکہ جب کہ جنوبی صوبوں میں کم ہیں، فحاشی اور بد اخلاقی بے راہ روی کے فروغ میں ان کا خصوصی ہاتھ رہتا ہے۔

کالے مسلمانوں کے متعلق ہندوستان میں سنا تھا کہ بالکل گمراہ ہیں، لیکن یہاں آکر پتہ چلا کہ اب راہِ راست کی طرف رخ شروع ہو گیا ہے کہ ان کی تحریک کے سربراہ علی جاہ محمد کے مرنے کے بعد ان کا بیٹا وارث علی قائم مقام ہوا، اس کا رجحان مسلمانوں کی طرف میلان اور تعصب کا ہے، ان میں جو لوگ اپنے کو بلالی کہتے ہیں، ان کا اصلی اوسط اور مرکز شکاگو ہے، یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے وسطی علاقہ میں واقع ہے، یوں یہ لوگ امریکہ کے بہت سے شہروں اور علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں، نیویارک میں ایک تعداد میں ہیں، کالے امریکیوں کی ایک تعداد قتل و تشدد کے واقعات کا سبب بھی ہے جس سے رشد امریکی زندگی میں خاصا پیدا ہو گیا ہے، نیویارک کے بعض محلوں میں لوگ اپنے گھر [illegible] سمجھتے ہیں۔ یہاں دیہاتی آبادیاں بھی ہیں، یہاں کی معمول کی [illegible] معلوم ہوتی ہیں، متوسط آدمی وہاں بھی بہت مرتب اور معیاری زندگی گزارتا ہے اور اس کی آمدنی اس کے لئے سامان بنتی ہے، ہمارا اندازہ ہے کہ ہندوستان میں ایک آدمی جس اوسط سے روپے پاتا ہے یہاں کا آدمی اسی اوسط سے [illegible] پاتا ہے [illegible] کے علاوہ یہاں ہندوستان کا ایک روپیہ صرف میں آتا ہے یہاں اس کام کے ۲ [illegible] خرچ ہوتا ہے [illegible] جب کہ [illegible] کے لحاظ سے دونوں ملکوں میں تقریباً ایک اور [illegible] کا فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو بہت بڑا دولت کے ساتھ وسائلِ معیشت اور دولت عطا فرمائی ہیں، ملک بہت پھیلا ہوا اور بڑا ہے [illegible] [illegible] ثروت میں بھی کی اور [illegible] ہوگا۔ معدنیات اور [illegible] کی بھی [illegible] ہے یہاں کی قوم نے اپنی دولت سے [illegible] بھی پورا اٹھایا ہے۔ [illegible] اس وقت (باقی آئندہ)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

ایک ہمہ جہت اور جامع صفات شخصیت

عبدالصمد ندوی دریابادی

سوال سے پہلے ایک بچے سے کسی نے پوچھا بتاؤ اللہ میاں کیسے ہیں؟ فطلائد جواب بغیر کسی توقف کے نکلا "جیسے مولانا صاحب"! بچپن تو خیر اب کب کا گزر گیا لیکن الوہیت اور عبدیت کے ذاتی و صفاتی فرق کے ساتھ وہ تصور اب تک ذہن میں ہے، مولانا مرحوم کی شفقت، مہربانی، عفو، ناراضی، رسائی، خیر خواہی، غرض وہ ساری خدائی صفتیں جو عباد اللہ کی پہچان ہیں، بچپن کے اس تصور کو برابر حقیقت میں بدلتی رہیں۔

لوگوں نے لکھا اور لکھیں گے کہ مولانا کی وفات سے ایک تہذیبی اور تمدنی عہد کا خاتمہ ہو گیا، اعلیٰ اخلاقی یا مشرقی قدروں کا ایک دلکش نمونہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، حالی، شبلی، اکبر، جوہر، اقبال اور سید سلیمان ندوی کی سی باکمال ہستیوں کا غم یک وقت تازہ ہو گیا اور ایک ہمہ جہت اور جامع صفات شخصیت نہ رہی، واقعہ ہے کہ ایسی شخصیت جس کی تشکیل و تکمیل میں اتنے اہم عناصر کی کارفرمائی شامل ہو اب مشکل سے ہی دیکھنے کو ملے گی۔

اصل یہ ہے کہ مولانا نے جس زمانہ، گھرانہ اور ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ دور تھا ہی کچھ عجیب، ایک جمی جمائی تہذیب کا چل چلاؤ اور اس کی جگہ ایک دوسرے اور اجنبی طرز زندگی کی شروعات، دھوپ چھاؤں میں سے شروع ہو گئی،

مولانا کی آنکھوں نے جس روشنی میں دیکھنا اور پہچاننا سیکھا وہ یقیناً ڈھلتے دور کے سورج کی روشنی تھی لیکن جن روشن دانوں سے یہ روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی وہ بھی حالی قدیم تھے،

دادا مفتی مظہر کریم قدیم علوم کے امین تھے، والد صاحب حاجی عبدالقادر گرچہ مولوی تھے لیکن اس زمانہ کے ڈپٹی کلکٹر بھی تھے، پس منظر سراسر مذہبی لیکن پیش نظر کچھ نئی تجلیاں بھی تھیں، تعلیمی آغاز روایتی طور پر مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی کتابوں اور مولوی سید محمد ذکی اور مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی کے تلمذ سے ہوا لیکن زمانہ نے رخ، کیننگ کالج لکھنؤ، سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی اور ڈاکٹر گیرن کی طرف موڑ دیا، یہ تعلیمی سفر اس زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کی کہانی خود بیان کر رہا ہے، غدر کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ صورت حال عجیب تھی اذیت ناک رد اور ناخوشگوار قبول کی کشمکش یا کسمساہٹ تھی، پرانی پیڑھیاں اپنے قدیم و مضبوط اعتقاد کی بنا پر کچھ رہی تھیں کہ تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دیں لیکن نئی نسل کے لئے اس دوراہے پر صراط مستقیم کا انتخاب آسان نہ تھا، اس لئے ذرا بھی تعجب نہیں کہ جو بچہ، بچپن میں اسلام کا پرستار اور عیسائیوں کی تردید کا خواستگار تھا وہ جب عقل کی پختگی کی منزل میں پہنچا تو اسلام سے نہ صرف بیگانہ بلکہ بیزار بھی ہو چکا تھا، مولانا کا یہ دور جو ان کی ہر تشکیک والحاد کا دور تھا ان کی زندگی کا سب سے اہم دور ہے، اسی زمانہ میں وہ جدید مغربی لٹریچر سے متعارف ہوئے پھر متاثر ہوئے ذاتی اعتبار سے شاید اتنا اہم نہ سمجھا جاتا لیکن ہوا یہ کہ وہ ان مادہ پرست نظریات کے مبلغ بھی بن گئے، اسی دور کی تصنیفات مبادی فلسفہ، فلسفہ اجتماع اور فلسفہ جذبات جیسی بعد میں خود انہوں نے اپنی تصنیفات کی فہرست سے خارج کر دیا اور دوسرے مضامین میں مغربی فلاسفہ کے خیالات کا عکس یا ترجمانی جگہ جگہ نظر آتی ہے، اس ملحدانہ دور یا مذہب بیزاری کی مدت شاید دس سال رہی،

یہ دور ملحدانہ ضرور تھا لیکن اس میں جمود نہ تھا

عقلیت ان کی فطرت سلیم پر غالب آ گئی تھی، عقل و فطرت کی کشمکش میں اگر فطرت جویائے حق ہے تو عقل کا غلبہ زیادہ مدت تک نہیں رہتا، اس طبع حق پسند کے ساتھ ان کی خوش نصیبی یہ تھی کہ اس زمانہ کے مصلحین کی توجہ بھی ان کو حاصل ہو گئی، اکبر، جوہر، مہدی افادی اور مولانا شبلی، ان عناصر اربعہ نے مولانا کی روح کو ایک اور ہی قالب عطا کیا، کیسی عجیب بات ہے، ایک شاعر، ایک لیڈر، ایک رنگین انشاپرداز اور ایک وہ جسے زاہدوں نے کافر

اور کافروں نے مسلمان سمجھا۔

ان سب نے مل کر ایک ایسے ذہن کو اسلام کی سمت موڑا جو ممکن تھا کہ متوازی سمت میں اسلام کے لئے خطرناک و مضرت رساں ثابت ہوتا، ان چاروں میں کوئی بھی تو قطعاً نہ عالم دین تھے نہ کسی خانقاہ کے گوشہ نشین، لیکن اسلام کی حمایت و غیرت میں ایسے سرشار کہ ایک زرگری گرمی بھی ان سے دیکھی نہ گئی، سوچنے والا کبھی کبھی اس اتفاق پر شکر ادا کرتا ہے ورنہ یہ بھی تو ممکن تھا کہ دستار و جامہ اور زہد و دعا، جوش اسلامی میں کفر کے فتوے اصدار کرنے کی ساعت والا لہولہان ہو جاتا، شاید وہ ایسی بھی ہو جاتا لیکن کون جانے وہ مبلغ ہوتا بھی یا نہیں، مولانا کی بعد کی زندگی میں [illegible]

ایران کے اسلام لانے کے اسباب واثرات نظر آتے ہیں ان کے ناقدین یا معترضین ان کے بعض دینی خیالات پر سخت گرفت کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی گرفت حق بجانب ہے لیکن اگر وہ مولانا کی زندگی کے اس سب سے اہم دور کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو انہیں یقین ہو جائے کہ مولانا کا مسلک خواہ شیعوں سے متعلق ہو یا احمدیوں سے، اس میں بہر حال وہ سوز و کرب اور اس درد سے پیدا ہونے والی ہمدردی ہے جس سے کبھی خود مولانا کا سابقہ ہوا تھا، گم کردہ راہ سے ہمدردی و محبت اس سے بڑھ کر اور کیسے ہو سکتی ہے جو خود کبھی گم کردہ راہ رہا ہو۔

جن لوگوں نے ان سے باتیں کی ہیں، ان کی تقریریں پڑھی ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ کاڑ کڑ کتے ہیں ان کے لہجہ میں سختی اور انداز بیان میں درشتی کیوں نہ ہوتی تھی، ان کی باتوں سے ہمیشہ اس کا اظہار ہوتا رہا کہ میں تو اس رسول کی امت میں ہوں جس کا شعار گنہگاروں کی شفاعت اور خطاکاروں سے درگزر رہا ہے پھر بھی بے دھڑک کفر کا فتویٰ اور مجرم کا پروانہ کس طرح عطا کر دوں۔

بقیہ مولانا عبدالماجد [illegible]

گیسوؤں سے نکل کر اس کوچہ تک آگئے؛ جو ہمیشہ عاشقوں، دیوانوں اور اہل جنوں سے آباد رہا ہے، یہ جان مادہ کے کھیل اور بچے تجربہ کے بعد جب ہوش روحانی رات ملی تو پھر مولانا نے جیسے مڑ کر نہ دیکھا، اکبر و جگر جیسے راہ دکھانے والے شبلی، سلیمان اور مرشد تھانوی نے منزل مقصود تک پہنچا دیا، عشق کی شورش نے دیوانگی اور پھر جنوں کا رنگ اختیار کیا۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی دیوانگی میں شائبہ ہمیشہ فرزانگی کا شامل رہا، انہیں منصور کی تنگ ظرفی والی تقلید منظور نہ تھی، مرشد بھی باہوش ملا جس نے دیوانہ کو فرزانہ بنا دیا۔

ممکن ہے کبھی کبھی پاسبان عقل کو تنہا بھی چھوڑ دیتے ہوں لیکن اس تنہائی اور خلوت کی لذت کو نہ انہوں نے مشتہر کرنا چاہا نہ اس کی شہرت ہی ہوئی، میری نگاہوں کے سامنے اب بھی وہ منظر ہے جب بھوپال میں وہ حضرت شاہ یعقوب صاحب مجددی کے سامنے سر جھکائے، خاموش، زانو تہ کئے ہوئے تھے، حضرت جب باادب ہوتا

ہے تو منظر ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

پھول دھیان تو سراپا ناز کا شیوہ ہے، سرتاپا نیاز کا ——— مولانا جا بجا تحریروں اور اکثر نشستوں میں یہ مصرعہ عجب انداز سے پڑھا کرتے تھے۔ ع

خیال ہی میں مزہ وصل دلربا کے لئے

اب سوچتا ہوں بھوپال کی وہ نشست کہیں اسی مصرعہ کی عملی تشریح تو نہ تھی!

مولانا جنوں کی اس منزل تک تو بعد میں آئے اس سے پہلے راہ میں عشق نے اپنے جو جادو جگائے، وہ ہے سمجھنے کی چیز، فلسفیانہ مضامین، مکالمات، مکاتیب، پھر آپ نے دو پشیمان قلب کی غبار راہ بن کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی، تب آپ تو تمام نظر رنگ و بوکی رعنائیاں تھیں، سیاسیات قرآن، اسلام، تمدن اسلام، اکبر نامہ، سفر حجاز، جغرافیہ قرآنی، اعلام القرآن، محمد علی ذاتی ڈائری، بشریت انبیاء، حکیم الامت، خطبات ماجدی اور پھر سب سے بڑھ کر تفسیر ماجدی اور زندگی کا ہر سفر کامیاب کے کنارے تک وہ قافلہ لے گیا یا کر ساری زندگی ادب کی منزل میں گم ہو گئی۔

وہ نے جو کو حال کی نظر یکسانا

سکھانی عشق نے جو کو صورت رندانہ

مولانا کی کتابوں میں خواہ انکے نام اور موضوعات کتنے ہی متنوع کیوں نہ ہوں ایک چیز قدر مشترک کے طور پر ہر جگہ نظر آتی ہے اور وہ ہے اسلامی روح، وہ "سچ" اور "صدق" کے صفحات ہوں یا دوسری کتابوں کے بے شمار مقدمے، دیباچے، تقریظیں اور تبصرے، ان کے سوچنے سمجھنے جانچنے و پرکھنے کا معیار یا اس معیار کا عنصر غالب صرف یہی چیز تھی، انہوں سے ناراضی ہو یا غیروں کی مداحی و صلاح کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ کسوٹی ان کی اسلامی روح تھی ——— یہ بات بھی دن روشن کی طرح عیاں ہے کہ انہوں نے اسلامی روح کو آب و رنگ دیا تھا اب یہ

وہ فطری لحاظ سے ادیب تھے،

فلسفہ کا خشک موضوع ہو یا تفسیر کا علمی مبحث، قدیم علماء کے تصورات ہوں یا جدید دانشوروں کے نظریات، حجاز و ارض پاک کے سفرنامے ہوں یا محبوب و ممدوح شخصیتوں کے خاکے، ادب سے ان کا رشتہ کہیں نہیں ٹوٹتا اور ادب میں بھی طرز کی خاص صنعت پر زیادہ توجہ رہی ہے کہ شاید وہ موجد بھی تھے اور خاتم بھی ——— وہ اسلام کے خلاف یا اپنی گستری میں مشرقی تہذیب کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہ کرتے تھے ان کا خمیر و ضمیر تیار ہی ایسا کیا گیا تھا جن پاک روحوں نے اس خمیر کی تیاری میں حصہ لیا تھا خود ان کا وصف ذاتی یہی تھا کہ وہ مغرب کی فضاؤں میں پلنے بڑھنے کے باوجود زیر بال کر قید دکھا سکے تھے اور نہ کہہ سکتے تھے خواہ منطق بیدا گر اور عقل فسوں ساز اس پر کتنی ہی بعد کیوں نہ ہوتی کہ جو نظر آتا ہے وہ سراب نہیں چشمۂ حیات ہے۔

یگانہ چنگیزی ہوں یا جوش ملیح آبادی ہوں یا حیات اللہ اور عظیم بیگ ہوں یا خشتر، انہیں کسی سے ذاتی پرخاش نہ تھی لیکن جہاں حرف اسلام کی عظمت اور اس کے اصولوں پر آئے وہاں وہ سارے رشتوں اور تعلقات کو بالائے طاق رکھ کر میدان میں آجاتے تھے۔

اللہ کے لئے محبت اور اللہ ہی کے لئے نفرت، ایمان کامل کی علامت ہے اور شک نہیں کہ مولانا نے قدم قدم پر اپنے

کامل ہونے کے ثبوت فراہم کئے، سوچتا ہوں کہ وہ جو جاتا گاندھی کے جذبۂ توحید، راجا مہیندر پرتاپ دوستی کی نعت گوئی اور مالک رام کے غیر مسلمان ہونے سے "عجب کیا ......" کی توقعات قائم کر لیا کرتے تھے وہ تنگ نظر متعصب اور آج کل کی اصطلاح میں دقیانوسی کیسے ہو سکتے تھے، اصل میں بات یہ ہے کہ محبت و نفرت کا معیار ہی کچھ اور تھا ۔ سگ نفرت بھی کسی سے تھی محبت بھی کسی

اپنوں کے احتساب میں یہ تقاضائے فطرت کچھ زیادہ شدید تھے،

اس احتساب کا تعلق صرف افراد سے ہی نہیں، اجتماعی اداروں اور بعض تو خالص اسلامی اداروں جیسے ندوۃ العلماء اور دار المصنفین تک سے تھا ان اداروں کے ذمہ داروں سے خود ان کی وفات پر جیسا اظہار غم ہی سب کچھ کہا وہی یہ بات بھی کہی کہ ان کا سب سے بڑا محتسب جاتا رہا، اب بزرگانہ انداز میں ٹوکنے والا مخلصانہ گرفت کرنے والا اور ہمدردانہ مشورے دینے والا ۔۔ جاتا رہا، کیسا پر شفقت سچا اور موثر تھا،

محتسب کی خیر ہو اونچا رہے اسکے نام سے

رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانہ کا نام

اب یہ ظرف کی بات تھی کہ کسی نے اس احتساب کو سر آنکھوں پر لیا اور کوئی چراغ پا ہوگیا، ظرف کا ذکر آیا تو ایک واقعہ یاد آگیا، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم صدر جمہوریہ منتخب ہوئے اس سے قبل مولانا ان کی کئی باتوں پر گرفت کر چکے تھے، بارہا ان کے لئے بھی اٹھتے تھے لیکن ذاکر صاحب اور مولانا جن بلندیوں پر تھے وہاں ایسی پست باتوں کا کیا گزر، اخیر کی بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب نے صدر منتخب ہوتے ہی فوراً تعلق میں مولانا کو بذریعہ تار اس کی اطلاع دی، یہ وقت تھا کہ مصلحت شناس دنیا سب کچھ فراموش کر کے دیرینہ تعلقات اور آئندہ بہترین توقعات کے خوابی نواہی ڈھیر لگا دیتی لیکن مولانا نے صرف "الحمد للہ" لکھ کر اپنے امتیازی ادبی وصف کا خوبصورت ترین استعمال کیا، لطف یہ کہ ذاکر صاحب نے "سبحان اللہ" کہہ کر وصول کرنے کا حق بھی ادا کر دیا۔ ع

جی کرتے ہیں جسے وہ مرا مشکل ہے

جو اہل دل خود مولانا کی کئی باتوں سے جدا کب الگ وہ سمجھتے تھے، اس کے ساتھ

مجھے یاد ہے کہ سنہ ایسی جب کہ شاید جنرل انتخابات ہو رہے تھے وہ دریاباد سے ۸ - ۹ میل کے فاصلہ پر رام سنیہی گھاٹ، تقریر کے لئے آئے، وہاں پر مجھے مولانا یاد آئے، بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ اس شام جمہوریہ ہند کا وزیر اعظم، دریاباد کے سنسان مقام پر راستہ کی ناہمواریاں سہتا ہوا صرف دو تین آدمیوں کے ساتھ مولانا سے ملنے خاموشی سے آیا اور چلا گیا، یہ واقعہ بھی دونوں کی وسعت ظرف کی شہادت دیتا ہے

اُدھر وہ مشرق کی تابانی فخر وضعداری سے اور ادھر وہ مغرب کی خوش گوئی و صداقت گفتاری سے۔

مولانا تھے جیسا سے ہے ایک بار فرمایا کہ مولانا مرحوم جامع صفات تھے، جامع اضداد بھی تھے، ان کی بات تو یہ ہے کہ تصویر ایک ایسا تراشا ہوا ہیرا رنگا رنگ تھا جس کا ہر رخ اور ہر رنگ مختلف بھی ہو اور محبوب بھی!

انیسویں صدی سے چلتے چلتے بیسویں صدی کو ورثہ میں جو لعل و جواہر سونپے تھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان میں سب سے نایاب اور قیمتی ہیرا تھے، ان کی یہ جامع صفات دراصل ان کی اپنی اسی مخصوص شخصیت اور ذاتی ریاضت کا پرتو تھی جسے مکمل انسانیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے،

ان کے پاس بیٹھنے والے کچھ ایسے بھی تھے جنہیں ان کے علمی و ادبی مقام سے بحث نہیں، انہیں ان کی انسانیت سے عشق تھا،

وہ جو بڑوں میں بڑے اور بچوں میں انہیں کے سے ہو جاتے تھے، جنہیں اپنے معاشرتی فرائض کا خیال اسی قدر تھا جتنا قومی و ملکی معاملات کا، ان کے پاس بیٹھنے والوں میں کبھی کبھی تو تین تین نسلوں کا اجتماع ہو جاتا لیکن پھر بھی بڑے سے بڑا صاحب علم اور معمولی کم سواد ان کی مجلس سے یکساں لطف و کیف اٹھا سکتا تھا اور اٹھاتا تھا، بڑی باغ و بہار شخص مجلس ہوتی، وسعادت کا تذکرہ جتنا کیا اتنا تھا شبلی و تھانوی کا ذکر اکثر رہتا، اکبر کے اشعار اور جو ہر کی گفتار کی بھی تکرار رہتی ہمہ وقتا

کا ذکر، وہ بھی ایسے عاشق کی زبان سے!! آہ، تاثیر و تاثر کا وہ سماں اب کہاں! پھر اس مجلسی گفتگو میں ضلع جگت، تلازموں اور محاوروں کے ایسے برجستہ و برمحل استعمال جو سننے والوں کو نہ صرف ذوق کی پاکیزگی بلکہ ایک عجیب روحانی نشاط سے ہمکنار کر دیتے، کیسی کیسی باتیں یاد آ رہی ہیں، لکھنؤ سے ایک صاحب نے وہ چیز بھیجا جسے انگریزی میں "چیز" کہتے ہیں، ایک خط میں کس مزہ سے اس کا استعمال کیا "ناچیز کو کیا چیز آپ نے بھیجی"۔ لکھنؤ کے مشہور عالم و حکیم جناب محمد زمان صاحب قاسمی نے اپنے دواخانہ کا تیل اور سرمہ بھیجا، اسی وقت ایک سطر لکھ کر کس غضب کا شکریہ ادا کیا "جناب کا تیل اور سرمہ ملا، سر آنکھوں پر"۔ دریاباد میں ایک کنواں بنایا ہوا، خبر اڑی کہ اس کا پانی ہر مرض کی دوا ہے، پھر کیا تھا حکیم شمس الدین مرحوم کو یہ خوبصورت جملہ لکھ بھیجا "آجکل دریاباد کی خلقت کنویں کی چاہ میں باؤلی ہو رہی ہے"۔ والد صاحب قبلہ کے ہاتھوں میں کتاب دیکھی، کہہ اٹھے "صدیق میاں اہل کتاب تو ہو گئے، صاحب کتاب کب ہوں گے" ان کے دیرینہ رفیق و ہمدم جناب مولوی تقی خان صاحب کے چاروں صاحبزادے ندوہ کے فاضل، بس کنیت تجویز ہو گئی "ابوالندوہ" بھوپال میں ایک صاحب محمد اسرائیل نامی سے ملنے گئے، انہوں نے اپنے بیٹوں کا تعارف کرایا، ساتھ میں شاید مولانا عمران خان صاحب کے صاحبزادہ بھی تھے فوراً یہ فقرہ زبان پر آگیا "بھئی یہ آل عمران کے ساتھ بنی اسرائیل کی ملاقات خوب رہی"

ہستیوں میں بھی ان کا یہ جمالیاتی اثر کر گیا تھا،

دریاباد میں ایک صاحب نے کپڑے کی دکان کھولی، دوکان کا نام مولانا سے تجویز کرانا چاہا، مولانا نے عارفی جلسہ پر یہ کام چھوڑا، خوب خوب نام تجویز ہوئے لیکن انور بھائی زیادہ مزاج شناس نکلے، نام تجویز کیا "آپ کی دوکان"، اور مولانا پھڑک اٹھے "خوب خوب" کہہ کر دیر تک لطف لیتے رہے، عتیق، میرے برادر محترم کا نام ہے، ایک دن ان سے کہنے لگے "میاں اب تمہارے گھر کا نام "بیت العتیق" ہونا چاہئے"۔ یا خیر کیسی کیسی یادیں ہیں! ان کی ہر نشست میں بیٹھنے والے کی تمنا یہی ہوتی تھی کہ الٰہی یہ صحبت دراز تر ہوتی رہے، پُر لطف باتوں کے ساتھ مولانا کا مخصوص خطابی انداز بیان اور ایک دلنواز دوری [illegible] مولانا کے سرخ و سفید چہرہ اور نورانی [illegible] سے ملا ہوا اور باسلیقہ [illegible]

دکھلاتا تھا، بس ایسا نظر آتا کہ، تختہ گل ہے اور گل مہر اور املتاس کے سرخ و زرد پھولوں سے چاندنی چھن رہی ہے،

سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رض کی نگاہ جب روئے انور کے دیدار سے شرف یاب ہوئی تو وہ بے اختیار کہہ اٹھے "لیس ھذا بوجہ کذاب" (یہ چہرہ کسی دروغ گو کا نہیں) مولانا اسی ماہ رخ عظیم رسالت کے ایک پروانہ تھے، پھر کیا عجب کہ دیکھنے والے ان کو دیکھ کر کہہ دیتے کہ ہاں یہ چہرہ بھی سچ اور صدق کے خادم ایک سچے کا چہرہ ہے۔

زندہ دلی، شگفتہ مزاجی، سبک روحی اور خوش طبعی ان کی طبیعت کا خاصہ تھیں لیکن یہ باتیں صرف اسی وقت کی یادگار ہیں جب وہ زندگی کے سفر میں تنہا نہ تھے، شریک حیات ہر گام پر ساتھ تھیں، ان سے بچھڑنے کے بعد سبک روحی و خوش طبعی کے جوہر ممکن ہے کچھ باقی رہے ہوں لیکن زندہ دلی اور شگفتگی تو جنت مکانی اماں بی کے ساتھ ہی بھولی بسری باتیں ہو چکی تھیں، پھر تو نشستوں نے سماں کچھ اور دکھایا، دنیا سے بے تعلقی، آخرت کا ہمہ وقت ذکر یا پھر خاموشی اور ایک مستقل سی [illegible] نے کہ روح تک میں سرایت کئے ہوئے تھی، معمولات اب بھی ہمیشہ کی طرح وقت کی پابندی، ترتیب و سلیقہ کے ساتھ جاری تھے تصنیف و تالیف، سفر اور ملاقاتیں سب پہلے کی طرح لیکن اب نہ وہ جوش تھا نہ وہ سرمستی۔

دل تو ان کا کب کا ٹوٹ چکا تھا، حیدرآباد کی بربادی، بھوپال کا زوال، پھر آخر میں ڈھاکہ کا سقوط یہ تو بربادیوں کے عنوان تھے ورنہ ان کے مخزن حسن تہذیب، [illegible] تعلیمی اداروں اور عزت و ناموس پر جو تباہیاں آئیں ان کا کیا شمار،

پھر مزید مسلمانوں کی بے حسی، انہیں اس قوم سے خیر و بہبود کی توقع بالکل نہ رہی تھی، دینی جذباتی قوم جو مسجد کے ایک حصہ کی تعمیر ہونے پر ہزاروں جانیں قربان کر دیتی لیکن اپنی مسجد و دنیا کی تعمیر کے لئے ایک پیسہ نہ نکال سکتی، جو [illegible] کے لئے یوم سیاہ منا منا کر ایک ایک دن میں لاکھوں کا نقصان برداشت کر سکتی تھی لیکن اپنی ہی آواز کی شنوائی کے لئے ایک انگریزی اخبار کے لئے سرمایہ فراہم نہ کر سکتی، اس سے وہ کوئی توقع کرتے بھی تو کیسے؟ انہوں نے تقریباً ایک صدی کی تحریکوں

طوفانوں اور پھر بے حسی کے مظاہر کا مشاہدہ کیا تھا اس لئے اس سلسلہ میں ان کی رائے سے اختلاف کے باوجود ان کے احساس کی گہرائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طبقہ اور گروپ خصوصاً سیاسی تحریکوں سے الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ملت کے باشعور و باصلاحیت نوجوانوں کو ان ہنگاموں سے دور دیکھنا پسند کرتے تھے، مختلف مسلم جماعتوں سے ان کے اختلافات کو اسی پس منظر میں دیکھا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں بلکہ بدگمانیاں دور ہو سکتی ہیں۔

پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ انکی محبت و نفرت کا معیار صرف اسلام تھا، اور اس معاملہ میں وہ معصومیت کی حد تک مخلص تھے، ایک بار اخبار حریت میں بھولو پہلوان کی ایک بڑی سی تصویر گرز سمیت شائع ہوئی، شام کو مولانا نے سب کو یہ تصویر دکھائی، بڑی خوشی کے ساتھ تصویر دکھاتے جاتے اور کہتے جاتے کہ بھولو رستم زماں ہوئے، بہرحال نام اسلام اور مسلمان کا ہوا، ایک مرتبہ خبر آئی کہ پاکستانی ہاکی ٹیم میچ جیت کر کھیل کے میدان میں ہی سجدہ شکر بجا لائی۔ بس مولانا کی طبیعت کھل اٹھی، آنکھوں میں مخصوص چمک آگئی۔ دلی کے دو نامور مسلمان خاندانوں کا ذکر کرتے کہ تقسیم کے بعد ان دونوں نے نام بھی خوب کمایا اور پیسہ بھی، بس ایک نے نیک نامی سے اور افسوس ہے کہ دوسرے نے بدنامی سے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن اسلام سے ان کی محبت کے لئے خدا جانے کتنی بڑی بڑی باتوں پر بھاری ہیں، مسلمانوں کی ساری بے حسی یا بدعملی کے باوجود وہ خدا کی رحمت سے کبھی ناامید نہ ہوئے، رحمت کی آس لگانے والوں میں شاید ہی کوئی ان سے زیادہ ہو، جو کسی کا انتقال ہو [illegible]

ہوں مقدس ہستیوں میں ہوں، چاہے کتنا ہی باطول طلاقت کے بعد ہو [illegible] کسی مذہبی کے مقام میں ہوں، ہر ایک کے لئے وہ رحمت حق کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتے تھے، شاید وہ ہندوستان کے واحد ادیب تھے جن کے وفیات کے کالموں میں ایک پیراگراف اس قسم کے خیال نیک کے لئے وقف رہتا اور پھر کسی کی اصلاح سے تو وہ کبھی نہ مایوس ہوتے، دریاباد کے ایک قابل فخر نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس گئے، پہلے وہ خاصے دیندار تھے لیکن عقل و خرد کے جنگلوں سے وہ خود کو فرانس کی بے روح فضا میں نہ بچا سکے، واپس آئے تو مولانا کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے رہے لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ ان کے کسی قول و فعل پر مولانا نے ذرا بھی نکیر کی ہو، البتہ اکبر کی آئین کے مطابق ان کی اشاراتی تبلیغ جاری رہی اور آخر تک ان کی اصلاح کی توقع رہی۔ اس سے ملتی جلتی ایک بات اور یاد آگئی، دارالمصنفین کا ایک وفد دینی مالی ضرورتوں کے لئے بمبئی گیا، مولانا بھی اس وفد میں شامل تھے بمبئی کی ایک بہت مشہور مسلمان فلمی شخصیت نے ایک صاحب کے ذریعہ دارالمصنفین کی لائف ممبرشپ کے لئے روپے بھیجے اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ ان مقدس ہستیوں کے سامنے آنا میرے لئے باعث شرم و حجاب ہے اس لئے خود حاضر نہیں ہو سکتی، بس مولانا ان صاحب اور ان کے پیشہ کے سارے معائب کے باوجود ان کی اصلاح کے آرزومند و دعاگو ہو گئے، یہ دو انفرادی واقعات ہیں لیکن اس کے پیچھے اس جذبہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے، جسے ارحم الراحمین اور رحمۃ للعالمین پر افتخار بھی تھا، جذبہ کے اسی خلوص نے انہیں سب سے جدا اور سب میں شامل "شخصیت عطا کی تھی وہ علی گڑھ والوں کے نزدیک اتنے ہی محترم و عظیم تھے جتنا ندوہ والوں کے ہاں، احتشام حسین، آل احمد سرور اور علی سردار جعفری ان سے ویسے ہی پیار سے ملتے تھے جیسے مولانا علی میاں، شاہ معین الدین اور صباح الدین عبدالرحمٰن۔

حد تو یہ ہے کہ راقم کے سامنے سمپورنانند اور پنڈت سندر لال ایک ہی صف میں نظر آتے، یہ سارا اعجاز ان کے خلوص، صدق دلی اور دلآویزی کا تھا۔

یادوں کا یہ سلسلہ دراز ہوتا ہے اور میرے لئے تو تقریباً [illegible] مولانا دریاباد، بھوپال اور لکھنؤ [illegible]

(باقی صفحہ ۸ پر)

بقیہ صفحہ ۳ : مکتوب امریکا

ملک جنگ دنیا کے ملکوں میں اس کا درجہ اول ہے۔

اب تو ہندوستانی، پاکستانی اور عربوں کی یہاں آمد اور سکونت بہت بڑھ چکی ہے ہر بڑے شہر میں سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں، تنہا نیو یارک میں ایک لاکھ ہوں گے۔

ملک نے پرائیویٹ سیکٹر کو اپنا رکھا ہے چنانچہ مختلف صنعتیں، ہوائی کمپنیاں، ٹیلی ویژن اسٹیشن، تعلیمی ادارے، ریلوے سب پرائیویٹ ہیں اور خوب ترقی پر ہیں۔

کانفرنس کے چار دن بلومنگٹن میں گذرے۔ بلومنگٹن اور انڈیانا پولس کے متعلق ذکر کرنا رہ گیا ہے کہ یہ بہت ستھرے اور دیگر شہروں کے مقابلہ میں زیادہ پرسکون ہیں ہم لوگوں کا قیام یہاں بھی ایک کالج میں تھا جو کانفرنس کے مستقر سے قریب تھا۔

بلومنگٹن میں کانفرنس چار روز رہی اس میں صبح کو درس قرآن ہوتا، دن میں اسلامی موضوعات اور اسلامی دعوت کے مسائل پر گفتگو ہوتی، اس کے بعد مختلف موضوعات پر تقریریں ہوتیں، اجتماعات عام طور پر یونیورسٹی کے مرکزی آڈیٹوریم میں ہوتے یہ ایک شاندار وسیع آڈیٹوریم ہے۔ ماموں جی (مدظلہ) کی تقریر "اسلامی دعوت کے لئے مسلمانوں کے آپسی تعلقات ایک ذریعہ" کے عنوان سے ہوئی، یہ عنوان پہلے سے دیا گیا تھا، ماموں جی مدظلہ نے اس موضوع میں جزوی ترمیم کی اجازت لے لی تھی چنانچہ انہوں نے اسلامی اخوت کے موضوع پر تقریر کی، تقریر پرجوش تھی اور بہت پسند کی گئی۔ اس تقریر کے علاوہ بھی کئی دوسرے موقعوں پر بھی خطاب کرنے کا موقع پیدا ہوا۔ کانفرنس کی تفصیل انشاء اللہ علیحدہ سے بیان کریں گے۔ مسلمان طلبہ کا یہ اتحاد سالانہ کانفرنس کرتا ہے اور ہر سال اس کو ایک موضوع کے ساتھ محدود کر دیتا ہے چنانچہ یہ اجتماع اس کا پندرہواں سالانہ اجتماع تھا اور "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" اس کا عنوان تھا۔

اجتماع سے دوشنبہ کے روز فرصت ملی اسی دن دوسرے وقت بذریعہ کار شہر انڈیانا پولس آنا ہوا وہاں تقریباً دو روز ٹھہر کر ایم۔ایس۔اے کا مرکز اور اس کے دیگر ادارے دیکھے پھر ہوائی جہاز سے شہر بالٹی مور آئے یہ بھی خاصا بڑا امریکی شہر ہے، بندرگاہ بھی ہے اور صنعتی مرکز بھی ۲۰ لاکھ کی آبادی ہوگی، ترقی یافتہ بھی ہے اور یہاں کی یونیورسٹی اور میڈیکل ادارے شہرت کے مالک ہیں، یہاں ماموں جی مدظلہ کو اپنی آنکھ کے سلسلہ میں مشورہ لینا تھا، یہاں ایک مسلمان ماہر چشم ڈاکٹر شوکت سے پہلے سے بات ہو گئی تھی، ان کے یہاں ایک روز رک کر جمعرات کی صبح کو بذریعہ ٹرین نیو یارک واپسی ہوئی، ہمارے ماسٹر محمد حسیب صدیقی صاحب کے صاحبزادہ احمد مطیع صدیقی صاحب کے یہاں اترنا ہوا، ان کا اصرار بھی تھا، ریلوے اسٹیشن پر لاگوچہ سید صاحبزادہ حسین صاحب بھی آئے تھے ان کے یہاں ڈاکٹر مطیع صاحب کے جدہ جانا طے ہوا ہے، نیو یارک میں چار پانچ روز ٹھہرنے کے بعد امریکہ و کناڈا کے مختلف علاقوں کا ایک دس روزہ پروگرام ہے، انشاء اللہ تعالیٰ مقصد نکلے اور خیر و عافیت دیکھے۔ ہندوستان، پاکستان کی خبریں معلوم نہیں ہو رہی ہیں یہاں تو دنیا کے مشرقی ملکوں کی خبریں کم ملتی ہیں، ماسٹر حسیب صاحب آجکل ہیں آنے والے تھے ابھی نہیں پہنچے ممکن ہے کہ آجکل میں آتے ہوں، ان سے خیریت بھی معلوم ہوگی اور ان کی آمد سے اپنی دلچسپی بھی بڑھ جائے گی۔ سب جاننے والوں کو سلام کہیے۔ والسلام

محمد رابع

۲۰ر ۴ر ۷۷ء

اعتذار

وقت کی کمی، مدیر تعمیر حیات کے سفر اور منیجر تعمیر حیات کی رخصت اس طرح کی بعض مجبوریوں کی بنا پر تعمیر حیات کا خصوصی شمارہ بسلسلہ کنونشن حلقہ پیام انسانیت شائع نہ ہو سکا۔ اس سلسلے کے بعض مضامین اور تقریریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں گی۔

(منیجر)

بقیہ صفحہ ۶ : مولانا عبدالماجد دریابادیؒ . . .

میں ان کی محبت، شفقت اور حوصلہ افزائی کے نہ جانے کتنے چراغ روشن ہیں، کتنے موتی نشاں ہیں،

یادوں کا معاملہ بھی رنگوں اور خوشبوؤں کا سا ہے

نہ ہاتھوں میں آتی ہیں نہ احساس سے جدا ہوتی ہیں

کہاں تک ذکر کیا جائے پھر یہ بھی تو ہے کہ "حدیث دلبراں باشد بذکر دیگراں" مناسب ہے تو کچھ اپنا ذکر ہو۔

ہاں آخر میں ان کی ایک وصیت یا خواہش کا بھی ذکر کر دوں، میں نے آٹو گراف بک پر اپنے لئے کسی پیام کی خواہش کی، فرمایا "نہیں ایسے تکلفات کی کیا ضرورت"؟ لیکن پھر فوراً ہی یہ آیت لکھ کر زبانی بھی تلقین کی "ولا تموتن الا وانتم مسلمون" حق یہ ہے کہ ان کی یہ تمنا ہر مسلمان کیا ہر انسان کے لئے تھی وہ بڑی تلخیاں چکھنے کے بعد مسلمان ہونے کے لطف وکیف سے آشنا ہوئے تھے۔

کافر نہ شدی لذت ایماں چہ شناسی

اور کسی بھی سچے بادہ خوار کی طرح سارے میخانہ میں اس مے کے بٹنے لٹنے کی تمنا کرتے تھے وہ زندگی بھر اس مے کے آرزومند رہے پھر بھلا اس تصور کی صداقت میں کیا کلام کہ اب وہ ساقی کی بلاواسطہ توجہ سے کیسی کیسی گلابیاں چھلکا رہے ہوں گے، صدق کی پیشانی پر "والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ہم المتقون" کی آیت دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے والا اسی آیت کے شاہد کی بشارت آخرت میں کس مزہ سے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوگا۔

لہم ما یشاءون عند ربہم ذٰلک ہو الفضل الکبیر

حامد علی تعلیمی وقف

HAMID ALI EDUCATIONAL TRUST

حامد علی تعلیمی وقف کی جانب سے:

میڈیسن، ویٹرنری، انجینیرنگ، ٹکنالوجی، پالی ٹکنک، آرکیٹکچر اور زراعت کے گریجویشن کورسس میں تعلیم حاصل کرنے والے مستحق مسلم طلباء و طالبات کے نام تعلیمی سال ۷۸-۱۹۷۷ء کے لئے تعلیمی وظائف جاری کئے جائیں گے۔

- درخواستیں ٹرسٹ کے مجوزہ فارم پر تعلیمی صداقت ناموں کے ساتھ ۳۰ر جولائی ۱۹۷۷ء سے قبل دستخط کنندہ ذیل کے پاس پہونچ جانی چاہیئے۔
- فارم، دفتر ٹرسٹ سے (یکشنبہ اور عام تعطیل کے سوائے) روزانہ ۳ تا ۶ بجے شام ایک روپیہ نقد یا منی آرڈر روانہ کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔
- فارم کے اجراء کی آخری تاریخ ۲۳ر جولائی ۱۹۷۷ء۔

سید مظہر الحق قادری
(آنریری جوائنٹ سکریٹری)
فون: 220437

دفتر
حامد علی تعلیمی وقف، عقب [illegible]
قریب نیو ایم ایل اے کوارٹرس
بشیر باغ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

چار دن علیگڈھ میں

از :۔ محمد حسن انصاری

علی گڑھ کا نام سب سے پہلے غالباً اس وقت سنا جب اپنی ابتدائی تعلیم کے دوران درجہ چار میں سماجی علوم کے سبق میں پڑھا تھا "بنارس کی زری کی ساڑیاں، مراد آباد کے قلعی کے برتن اور علی گڑھ کے تالے مشہور ہیں"۔ پرائمری درجات کے کسی طالب علم کے لئے نہ تو تالا کوئی اہمیت رکھتا ہے اور نہ ہی زری کی ساڑیاں۔ اس کا مقصود تو ان چند جملوں کو ازبر کر کے امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر جب میں نے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا اور میرے گھر والوں کو مجھے کسی یونیورسٹی میں داخل کرانے کی فکر ہوئی تو برادر معظم کی نظر انتخاب علی گڑھ یونیورسٹی پر پڑی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ مجھے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ دلایا جائے مگر کچھ تو گھر سے دوری اور کچھ مالی مشکلات کے سبب برادر معظم کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور مجھے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ دلایا گیا جہاں میں نے چار سالہ تعلیم حاصل کی۔ شب و روز گذرتے رہے طالب علمی کا زمانہ ختم ہو گیا اور ملازمت کرنے لگا۔ علی گڑھ نہ جا سکا مگر کچھ لاشعوری طور سے اس کا خیال برابر بنا رہا ــ ایک چنگاری تھی کہ دبی رہی۔

جون ۱۹۷۶ء میں علی گڑھ کے پہلے سفر کی نوبت آئی۔ ان دنوں میں گورنمنٹ انٹر کالج باندہ میں جغرافیہ کے لکچرار کے فرائض انجام دے رہا تھا اور مجھے ایک مندوب کی حیثیت سے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کی جانب سے شعبہ جغرافیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے جغرافیہ کے سمر انسٹی ٹیوٹ میں شرکت کرنا تھا۔ اس میں شمالی ہند کے تقریباً چالیس منتخب مندوبین نے شرکت کی اور یہ سمر انسٹی ٹیوٹ ۲۵ جون ۱۹۷۶ء تا ۲۹ جولائی ۱۹۷۶ء رہا۔ اس طرح ایک دیرینہ تمنا کی تکمیل ہوئی۔ اللہ کارساز نے سب سامان مہیا کیا تو ایسا کہ متواتر ۳۵ دن تک علیگڑھ یونیورسٹی کے شب و روز دیکھنے کو ملے۔ ان دنوں ہم لوگوں کے قیام کا انتظام سر سید ہال کے عثمانیہ ہاسٹل میں کیا گیا تھا۔ اور ہمارے سارے پروگرام شعبہ جغرافیہ میں ہوتے تھے۔ راقم السطور کا یہ پہلا تعارف تھا ہندوستان کے اس دانشکدہ سے جس کی بنیاد سر سید احمد خاں مرحوم نے جولائی ۱۸۷۵ء میں ڈالی تھی اور اسے اپنے خون پسینہ سے سینچ کر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے موسوم کیا تھا اور جو ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے علم و ادب کے اس گہوارے کو قریب سے دیکھا اور سُنا جس سے اس تحتی براعظم کو مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، میر ولایت حسین، شیخ عبد اللہ (بانی ویمنس کالج علیگڈھ) مولوی وحید الدین سلیم، شاہ نذیر احمد غازی پوری، سجاد حیدر یلدرم، سید فضل الحسن حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولوی عزیز مرزا، مولوی عبد الحق، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا محمد اسلم جیراجپوری، علی برادران، اقبال اور سہیل، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے سورمۂ الآثار اور جیالے سپوت عطا کئے اور جو سر سید کی متاع حیات ہے۔

دس سال کے بعد فروری ۱۹۸۶ء کے اوائل میں علی گڑھ کے دوسرے سفر کا موقع ہاتھ آیا۔ یہ سفر پہلے سفر کے مقابلہ میں کچھ زیادہ خوش آئند تھا۔ اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین کہا گیا ہے وہ مسبب الاسباب ہے۔ اس بار مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی تصنیف "السیرۃ النبویۃ" (عربی) جو قاہرہ سے شائع ہو رہی ہے اور جس کا اردو ترجمہ "نبی رحمت" کے نام سے انشاء اللہ مستقبل قریب میں شائع ہوگا، میں شامل کئے جانے والے چند نقشوں کی تیاری کے سلسلے میں مجھے مولانا موصوف نے علی گڑھ بھیجا تھا۔ یہ چار روزہ سفر راقم السطور کے لئے ایک یادگار بھی ہے اور ایک متاع حیات بھی ــ متاع حیات اس لئے کہ اس سفر کی غرض و غایت کا تعلق سید الانبیاء رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ سے تھا۔ یادگار اس لئے کہ یہ سفر عالمی شہرت کے حامل دنیائے اسلام کی اس معروف شخصیت کی ایما پر عمل میں آیا تھا جس کے حکم کی تعمیل کرنا بڑے بڑے مؤقر حضرات اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ اس طرح سے راقم السطور کا حال مصر کے بازار میں سوت کی چند انٹیاں لے کر گھومتی پھرتی اس بے بساط بڑھیا جیسا رہا جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرانا ہی اپنے لئے باعث فخر و نجات سمجھا تھا۔

۸ فروری ۱۹۸۶ء کی شام کو رائے بریلی سے روانہ ہو کر ۹ فروری کی صبح علیگڑھ پہونچا۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ آفتاب طلوع ہونے میں ابھی کوئی دو گھنٹے کی دیر تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا، لہٰذا تانگہ پر چڑھ کر رکشہ والے سے سامان مسجد کے اندر رکھوایا اور فجر تک وہیں رہا۔ آبادی کے وسط میں ہی اس مسجد کا جائے وقوع بہت مناسب اور فضا نہایت کشادہ ہے۔ یہ ترکی طرز پر بنا ہے۔ بعد نماز فجر ڈاکٹر ابرار مصطفےٰ صاحب سے مسجد ہی میں ملاقات ہوئی جن کے یہاں اس سفر کے دوران مجھے قیام کرنا تھا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ بنگلہ لے گئے۔ ابرار مصطفےٰ صاحب علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں صدر شعبہ نباتات ہیں اور ان کا شمار یونیورسٹی کے موقر اور اس سن رسیدہ لوگوں میں ہوتا ہے ــ ڈاکٹر صاحب کا وطن مورجہ ہے شہاب

علی گڑھ ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نیک اور مومن صفت انسان ہیں باغبانی کا بہت شوق ہے۔ دلکش لان کا رکھ رکھاؤ، گلاب کی مختلف قسموں کا شوق، عمدہ سبزہ زار، چمن بندی کا صاف ستھرا ذوق جو علی گڑھ کا طرۂ امتیاز ہے، اس سے ڈاکٹر صاحب مستثنیٰ نہیں۔ حد سے لگاؤ عشق تک ہے حتیٰ کہ بسا اوقات عالم (بوائے سرونٹ) کو فرشی بچھا کر ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لانا پڑتا ہے۔ وقت کی بڑی قدر کرتے ہیں، خوش گپیوں میں (جو آجکل کے نوجوان طبقہ کی صفت خاص بن چکی ہے) وقت ضائع نہیں کرتے۔ ابرار مصطفےٰ صاحب ایک عمدہ انسان، ایک شفیق باپ اور ایک اچھے استاد ہیں۔

چونکہ جلسہ کی وجہ سے آج یونیورسٹی میں تعطیل تھی اس لئے اپنے ایک دوست کے ہمراہ قاسم پور جانے کا ارادہ کیا۔ قاسم پور روانگی سے پہلے یونیورسٹی کیمپس سے گذرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ جلسہ کے سلسلے میں وائس چانسلر جناب محمد علی خسرو کی رہائش پر جلسہ کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جلسہ کی کارروائی مائیکروفون کے ذریعے باہر سڑک پر صاف سُنی جا سکتی تھی۔ اپنے دوست کو ساتھ لینے کی غرض سے میں یونیورسٹی کے ایک ہاسٹل میں پہونچا تو وہاں مسلم یونیورسٹی کے ایک بہت پرانے طالبعلم سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ صاحب فخریہ انداز میں بیان کر رہے تھے کہ کس طرح ان کے زمانے میں کرنل ضیاء الدین نے کرکٹ بال پر ایک ایسا زور دار چھکا لگایا تھا کہ بال جامع مسجد کی مینار کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ یونیورسٹی کے ابتدائی دور میں منٹو سرکل کا ایک نمایاں رول رہا ہے۔ بات چیت کے دوران انہوں نے بڑے حسرت بھرے لہجے میں فرمایا کہ انھیں اپنی یونیورسٹی کی شیروانی میں نہ آسکنے کا کس قدر قلق ہے۔ اگرچہ وہ صاحب شیروانی زیب تن کئے تھے مگر ان کے لہجے سے اس بات کا صحیح اندازہ ہوا کہ علیگڈھ کے طالب علم کو اپنا یونیفارم کس قدر عزیز ہوتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا انتظام مرکزی حکومت کے زیر اہتمام ہے ــ یہ ریذیڈنشل یونیورسٹی ہے۔ یہاں کے ہوسٹل لائف کی ایک نمایاں اور امتیازی خصوصیت یہ رہی ہے کہ سینئر اپنے سے جونیئر کا اُس سے کہیں زیادہ خیال رکھتا ہے جتنا کہ کوئی بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کے لئے کر سکتا ہے (جاری)

اپنے سینئر کا بے حد ادب و لحاظ کرتا ہے یہ ہمارا سارا شفقت یہاں کی ایک گرانقدر روایت رہی ہے مگر اس سفر کے دوران مجھے اس کا کچھ فقدان نظر آیا جو اس مشہور ادارہ کے مستقبل کے لئے یقیناً اچھی علامت نہیں ہے۔

قاسم پور ہم لوگ ۹ فروری کو بعد نماز ظہر پہنچے۔ یہ مقام علی گڑھ سے قریب ۲۰ کلو میٹر دور ہے اور بذریعہ بس ۴۵ منٹ کا راستہ ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا تھرمل پاور اسٹیشن ہے جس کا کا شمار ایشیا کے بڑے پاور اسٹیشنوں میں کیا جاتا ہے اس کے اے۔ بی اور سی تین اسٹیج ہیں۔ اس وقت تیسرے اسٹیج کا کام چل رہا ہے۔ یہاں سے یوپی کے مغربی اضلاع کو بجلی فراہم کی جاتی ہے اس پاور اسٹیشن کی وسعت کا اندازہ اس بات سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہاں کی دس ہزار سے زیادہ کی آبادی بالواسطہ یا بلاواسطہ تھرمل پاور ہی سے منسلک ہے۔ میلوں رقبہ میں پھیلی اس آبادی میں متعدد ایگزیکیٹو انجینئرز اور سپرنٹنڈنگ انجینئرز کی رہائش گاہیں ہیں جو یہاں پر تعینات ہیں یہ ایک بڑی بستی کے مانند ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب عصر کی نماز ادا کرنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ اس بڑی بستی میں ابھی تک کوئی مسجد نہ تھی اب اللہ کے کچھ نیک بندوں نے اس کام کو شروع کیا ہے، اور خوش آئند بات یہ ہے کہ اس مسجد کی تعمیر میں یہاں کے مسلمانوں سے زیادہ یہاں کے ہندو حضرات نے گرمجوشی کا ثبوت دیا ہے جو ہمارے ملک کی ملی جلی تہذیب کے لئے فخر کی بات ہے۔

۱۰ فروری کو ۹ بجے صبح شعبہ جغرافیہ گئے جہاں مجھے یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر اور صدر شعبہ جغرافیہ پروفیسر محمد شفیع سے ملنا تھا۔ جغرافیہ کے میدان میں عالمی شہرت کی حامل اس شخصیت سے اگر وہ مختصر رہی مگر نہایت مفید اور خوشگوار۔ پروفیسر محمد شفیع ایک نہایت محنت کش، ذہین، متین اور سنجیدہ انسان ہیں ان کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ نے جو نام کمایا ہے وہ کسی کے لئے محتاج تعارف نہیں۔

بعد دوپہر کینیڈی آڈیٹوریم جو کینیڈی ہال کے نام سے مشہور و معروف ہے، دیکھنے گئے۔ اس آڈیٹوریم کی سن تعمیر ۱۹۷۲ء ہے۔ اس کی تعمیر سے متعلق اخراجات امریکہ کی فورڈ فاؤنڈیشن نے برداشت کئے ہیں۔ ۲۰۰۰ نشستوں والا یہ آڈیٹوریم ساؤنڈ پروف اور فائر پروف بنا ہے، اس میں کوئی ستون نہیں ہے اور جس لوہے کے اسٹرکچر پر اس کی چھت روکی گئی ہے وہ عریاں ہے۔ آڈیٹوریم میں ماضی قریب میں منعقد سیمینار جس کا موضوع "اسلام تغیر پذیر دنیا میں" تھا کے افتتاحی خطبے اور اختتامی ہدایات کی صدائے بازگشت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یاد تازہ کئے دے رہی تھی، کینیڈی آڈیٹوریم ہر اعتبار سے ایک جدید ترین آڈیٹوریم ہے جب کہ یہاں کے اسٹریچی ہال میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ پرانے طرز کا ایک وسیع ہال ہے۔ وہ متعدد روسا کے عطیات کا ثمرہ ہے، جب کہ یہ ایک ادارہ کی دریا دلی کی آئینہ دار ہے اگرچہ دونوں کی عمروں میں قریب نصف صدی کا فرق ہے مگر دونوں کے نام سے مغربیت کی بو آتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان واقع ہے مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری کا۔ یہ لائبریری ایک جدید نو منزلہ عمارت میں واقع ہے اس میں تین لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں، ان کے علاوہ بہت سے نوادرات اور قلمی نسخے اس کتب خانہ کی زینت ہیں۔

اس کے ایک سیکشن میں کانگریس لائبریری نیو یارک کی کتابوں کے کیٹلاگ کا مکمل سیٹ دیکھنے کو ملا۔ جو خود ایک چھوٹی موٹی لائبریری سے کم نہیں۔ لائبریری کا ٹیکسچول سیکشن (TEXTUAL SECTION) اپنی مثال آپ ہے اس میں بیک وقت ۵۰۰ طلبہ آرام کے ساتھ بیٹھ کر مطالعہ کر سکتے ہیں، یہ سیکشن ان طلبہ کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا ہے جو مالی مشکلات کے سبب نصاب کی کتابیں نہیں خرید سکتے ہیں۔

یونیورسٹی کیمپس میں یہاں کے مختلف شعبہ جات کچھ اس طرح بکھرے ہیں جیسے آسمان پر تارے، جن میں کوئی ترتیب نہ ہونے پر بھی ایک دلکشی اور کشش ہوتی ہے۔ کیمپس میں جگہ جگہ ایک پوسٹر دیواروں پر چسپاں دیکھا جس پر جلی حرفوں سے لکھا تھا "کیا یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو ہونا چاہیے؟" یہ تو نہ معلوم ہو سکا کہ اس بڑے سوال نشان کے حق میں رائے عامہ کیا رہی مگر یہ ضرور ہوا کہ ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ء کو علی گڑھ کے "رجل رشید" اردو ادب اور مسلم یونیورسٹی کو سوگوار چھوڑ کر پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

شام کو بعد مغرب ناظم انتظامی

مسجد میں مرحوم رشید احمد صدیقی کے برادر خورد جناب نیاز احمد صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ نیاز صاحب میں انکساری اور سبک مزاجی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ ان دنوں رشید احمد کے انتقال کر جانے کی وجہ سے علی گڑھ میں ہی قیام پذیر تھے۔

علی گڑھ میں راقم السطور کا قیام ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ صاحب کی رہائش گاہ پر تھا جہاں میرے کمرے میں ساری سہولتوں کے ساتھ مطالعہ کا بھی معقول انتظام تھا۔ یہاں میں نے "اسلام تغیر پذیر دنیا میں" کے موضوع پر ہوئے سیمینار میں پیش کئے گئے متعدد مقالے پڑھے ان میں ایک مقالہ "سنوسیہ تحریک" پر تھا جو بہت پسند آیا۔ افسوس ہے کہ اس مقالے کے لکھنے والے کا نام یاد نہیں رہا۔ یہیں میں نے "AN INTRODUCTION TO SAUDI ARABIA" BY DOTA AL-SYED IBRAHIM BIN OMAR AL SAGOFF. کا مطالعہ کیا۔ ۱۳۷۶ھ میں سنگاپور سے مطبوعہ ۱۴۰ صفحات کی یہ کتاب نہایت دیدہ زیب ہے اور سعودی عرب کے متعلق بڑی عمدہ معلومات فراہم کرتی ہے۔ اگرچہ میں عربی نہیں جانتا پھر بھی نقشوں کی تیاری کے سلسلے میں، میں نے کچھ حد تک علی حافظ کی عربی تصنیف "فصول من تاریخ المدینۃ المنورۃ" سے فائدہ حاصل کیا۔ یہ کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور جدہ سے شائع ہوئی ہے۔

۱۱ فروری ۱۹۸۵ء کو قریب ۸ بجے صبح یہ روح فرسا خبر ملی کہ صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یونیورسٹی بند کر دی گئی ہر جگہ مرحوم کی شریف النفسی کے تذکرے تھے اور ہر مجلس میں ان کے اچانک انتقال کر جانے پر رنج و غم کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ بعد میں وائس چانسلر جناب محمد علی خسرو صاحب اور پرو وائس چانسلر جناب محمد شفیع صاحب دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ نماز جمعہ یونیورسٹی کی جامع مسجد میں ادا کی۔ یہاں کی جامع مسجد کی وسعت، نقش و نگار خاص کر آیات قرآنی سے محراب اور در و دیوار کی تزئین و زیبائش کے اعتبار سے اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور وہ منظر بھی

دورِ حج پرور ہوتا ہے جب نماز جمعہ کے لئے ہر طرف سے لوگ جوق در جوق یہاں کے خاص لباس شیروانی ملبوس اسی طرح سے نظر آتے ہیں جیسے کسی بڑے دریا کی طرف بارش کے بعد رواں دواں ندی نالے ہوں۔ اس بار یونیورسٹی کیمپس میں پہلے سے کچھ دیندار لوگ دیکھنے میں آئے اور مسجد میں بھی نسبتاً زیادہ آبادی نظر آئی۔ کہہ نہیں سکتا کہ یہ تبدیلی ملک میں ہنگامی حالات کے نفاذ اور نس بندی کی مہم (جو اب ختم ہو چکی ہے) کی دین تھی یا کہ اللہ کے ان نیک بندوں کی کوششوں کا نتیجہ جو دنیا کے گوشہ گوشہ میں جا کر اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کی تبلیغ میں مصروف کار ہیں۔ ایک خوشگوار اضافہ یہ دیکھنے میں آیا کہ جامع مسجد کے سامنے اسی کے حدود سے ملحق ایک کمرے میں قرأت کا ایک کمرہ مقرر کیا گیا ہے جہاں طلبہ کو قرأت کی مشق کرائی جاتی ہے۔

بعد نماز جمعہ ابرار صاحب کے مکان پر ایک دلچسپ شخصیت سے ملاقات ہوئی یہ صاحب خالص علیگڑھین ہیں نام غالباً سعید خاں ہے عمر ستر سے تجاوز کر چکی ہوگی۔ تعارف کے دوران جب انہیں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے تعلق کا علم ہوا تو فرمانے لگے۔ مولانا جمعہ کو سورہ "الکہف" پڑھنے کی بڑی تاکید فرماتے ہیں اور ان کے یہاں برابر اس پر عمل ہوتا آیا ہے اگر وقت کم ہو تو پہلی کی دس آیتیں پڑھ لے اور یہ کہہ کر خانصاحب نے قرأت شروع کر دی دوران قرأت ایک صاحب نے مداخلت کی تو ان پر برس پڑے اور انگریزی میں فرمایا "خاموش! میں قرآن پڑھ رہا ہوں اور تم مداخلت کرتے ہو"۔ سعید خانصاحب چند منٹ ہی ٹھہرے اور بجلی کی طرح چلتا ہوئے مگر ہمارے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑ گئے۔

۱۲ فروری کی صبح ابرار مصطفیٰ صاحب کی رہائش گاہ پر کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب احسان رشید صاحب ابن رشید احمد صدیقی مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ احسان صاحب اپنے والد صاحب کے انتقال کی خبر پا کر ہندوستان آئے ہوئے تھے افسوس ہے کہ تنگی وقت کے سبب احسان صاحب کی صحبت سے راقم السطور زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ احسان صاحب ایک ذہین، متین اور سنجیدہ شخصیت کے حامل ہیں۔

۱۳ فروری کو دوپہر میں مسلم یونیورسٹی کے [illegible] کو الوداع کہہ کر اسٹیشن ہو چکا اور [illegible] سے واپسی کا سفر شروع ہوا۔ [illegible]

[illegible]

ندوہ کا ایک چراغ

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

* ایک عظیم مصنف
* ایک نامور صحافی
* ایک جلیل القدر عالم

* سادگی کا پیکر
* خلوص کا مجسمہ
* تنہائی کا خوگر

اب کہاں ہیں ایسی شخصیتیں اور ایسے شفاف قلوب
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

مطلوب رضوان البسطمی ندوی (ایم۔ اے مدرسہ عالیہ کلکتہ)

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنے دورِ عروج میں جو بڑے بڑے انشاء پرداز اور نامور علماء پیدا کئے ان میں ایک مولانا عبدالسلام ندوی بھی ہیں۔ ان کی ولادت سنہ ۱۳۰۱ھ میں بمقام اعظم گڑھ ہوئی۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم محلے کے مکتب میں ہوئی، نیز فارسی کی تکمیل اپنے خسر مولوی عبداللہ صاحب سے کی بعد میں عربی تعلیم کے لئے کانپور اور آگرہ کا بھی سفر کیا پھر سنہ ۱۹۰۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۹۱۰ء میں یہاں سے فراغت حاصل کر لی۔

مولانا ادب و انشاء میں ممتاز تھے چمنستان ادب میں ان کا قلم بڑا ہی سبک خرام تھا مولانا کا قلم اتنا منجھا ہوا تھا کہ لکھنے کے بعد مسودہ پر نظر ثانی یا اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی تھی مولانا کا قلم کسی خاص موضوع تک محدود نہ تھا بلکہ ہر موضوع پر ہر وقت لکھنے کو تیار رہتے تھے، قلم کو جس طرح موڑ دیتے۔ مثلاً آپ نے اخلاق، فلسفۂ کلام، عقلیات، عمرانیات، الہٰیات، نفسیات، تفسیر و حدیث، منطق، تاریخ، سیر، معانی، بیان، بدیع، عروض، تنقید، خطابت، شاعری وغیرہ پر خوب لکھا اور ان سب موضوعات میں کامیاب اور ممتاز رہے۔

مولانا نے سب سے پہلا مضمون ندوہ کے دورِ طالب علمی ہی میں "تناسخ" جیسے اہم موضوع پر لکھا، جس نے علماء و ادبی دنیا میں ایک دھوم مچا دی اور اکثر اہل علم متعجب ہوئے علامہ شبلی کو یہ مضمون اس قدر پسند آیا کہ اس کو بغیر اصلاح کے "الندوہ" میں چھاپ دیا اور پانچ روپیہ انعام بھی دیا۔

اس مضمون سے مولانا عبدالسلام کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ہوا اور اس کے بعد برابر مضامین لکھتے رہے بعض کبھی تو ترجمہ کرتے اور کبھی طبع زاد مضمون لکھ کر کسی نہ کسی رسالے کو ضرور دیتے رہے جب مولانا کی علمیت و ادبیت ترقی کر گئی اور ان کا قلم پختہ ہو گیا تو زمانہ طالب علمی ہی میں مولانا شبلی نے ان کو الندوہ کا اسسٹنٹ اڈیٹر پھر اڈیٹر بنا دیا۔

اس کے بعد جب مولانا شبلی نے "سیرۃ النبیؐ" کے لکھنے کا کام شروع کیا تو مولانا عبدالسلام ندوی کو لٹریری اسسٹنٹ بنا دیا گیا اس وقت الندوہ جیسے بلند اور اونچے پرچہ میں مضمون نکل جانا ہی بڑی بات تھی چہ جائیکہ اس کا اڈیٹر پھر سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں شرکت سبحان اللہ۔

اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی الندوہ کے مدیر رہ چکے تھے۔ انہوں نے مولانا عبدالسلام کی علمی و ادبی ذہانت کا پورا پورا اندازہ کر لیا تھا، اس لئے جب مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال نکالنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے جہاں ملک کے دیگر نامور ادیبوں کو اس میں کام کرنے کی دعوت دی، وہیں مولانا عبدالسلام ندوی کو بھی بلا لیا اور مولانا ڈیڑھ دو سال تک الہلال میں کام کرتے رہے۔ لیکن اس درمیان حالات نے ایسا پلٹا کھایا یعنی جو الہلال کلکتہ کی افق سے آن بان اور شان سے نکل رہا تھا اور ہزاروں لاکھوں کے دلوں کو منور کر رہا تھا اچانک سنہ ۱۹۱۴ء میں الہلال کو برٹش گورنمنٹ نے بند کر دیا اور اسی سال ۱۸ نومبر کو مولانا شبلی بھی دار فانی سے آخرت کی طرف سدھار گئے اور ناچار مولانا عبدالسلام کلکتہ سے واپس آ گئے اور واپس جا کر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ساتھ دارالمصنفین میں کام کرنے لگے اور مولانا شبلی کے پیش نظر جو علمی کام تھے اور جن کو وہ اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے تھے مولانا شبلی کے ان ہی دونوں لائق وفائق شاگردوں (مولانا سید سلیمان ندوی و مولانا عبدالسلام ندوی) نے ان کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا اور اسی وقت سے وفات تک دارالمصنفین سے وابستہ رہے یہاں تک کہ مر کر ہی اس سے جدا ہوئے۔

مولانا ایک طرف ادیب، مورخ، شاعر و نقاد اور جید عالم تھے تو دوسری طرف سادگی کے پیکر اخلاق حسنہ کے ہمدردی و بھائی چارگی کا مجسمہ تھے ابتدائی تعلیم میں مولانا نے فارسی پر بھی پوری طرح کمال حاصل کر لیا تھا اور برادر نسبتی کے ساتھ آگرہ جایا کرتے تھے اور اکثر ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے اور کبھی غزل کہہ کر لے جاتے تھے اس لئے ابتدائی مشق سخن میں اس زمانے کے ذوق کے مطابق اچھے شعر کہنے لگے جس کی داد اس دور کے اساتذہ نے دی، مثلاً:

میں مر گیا ہوں کیس عرق چمن کے لئے
کرائیں چادر گل بلبلیں کفن کے لئے

بدگمانی سے انہیں میری نظر وہ کھٹکے
جھکے ذرے بھی اگر روزن دیوار کے پاس

آگرہ کے بعد مولانا اردو شاعری کے اصل مرکز لکھنؤ پہونچ گئے یہاں کے در و دیوار سے شاعری برستی تھی پرانے اساتذہ کی متعدد یادگار باقی تھیں، لکھنؤ کی فضا امیر مینائی اور جلال لکھنوی کی زمزمہ سنجیوں سے گونج رہی تھی۔ خود مولانا شبلی کی صحبت میں شعر و ادب کا چرچا رہتا تھا۔ اس ماحول نے مولانا کو پورا شاعر بنا دیا۔

فن شاعری پر مولانا کی نظر بڑی گہری اور استادانہ تھی جس کا ثبوت ان کی کتاب "شعر الہند" ہے۔ قدیم طرز کے دلدادہ بھی اس کے مانتے تھے اور جدید کی بعض جدتوں بلکہ بدعتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اس کو شاعری نہیں سمجھتے تھے فن کے قواعد کی پابندی اور زبان کی صحت و صفائی کو بڑی اہمیت دیتے تھے ان کو لکھنؤ کا اصلاح شدہ رنگ بہت پسند تھا اس لئے میر حامد علی جلال کو آخری دور کا سب سے بڑا شاعر مانتے تھے اور خود بھی اسی رنگ میں کہتے تھے گو کبھی کبھی داغ و امیر کے رنگ کے شوخ اشعار بھی قلم سے نکل جاتے تھے۔

مولانا اتنے مضامین لکھے ہیں کہ انہیں یکجا کر دیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں جو ان کی مستقل تصانیف ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

(۱) اسوۂ صحابہ (دو جلدیں)

پہلی جلد میں عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق و معاشرت وغیرہ کے متعلق صحابہ کرام کے موثر واقعات، دوسری جلد میں ان کے مذہبی سیاسی اور علمی کارناموں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے جس سے زندگی کے ہر شعبہ میں علمی کارناموں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے سے زندگی کے ہر شعبہ میں تعلیمات کا عملی نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

(۲) اسوۂ صحابیات

ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور عام صحابیات کے اخلاق و معاشرت کے متعلق موثر واقعات کا مجموعہ۔

(۳) سیرۃ عمر بن عبدالعزیز

جب عنان حکومت حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھوں میں آئی تو انہوں نے ہر طرح کے خطرات برداشت کر کے اس حکومت کو خلافت کے قالب میں بدل کر پھر ایک بار صدیقی اور فاروقی عہد کی یاد تازہ کر دی، انہیں حقائق تفصیل تاریخ کے اوراق پارینہ سے تلاش کر کے اس کتاب میں یکجا کئے گئے ہیں۔

(۴) مولانا شبلی کی تاریخ کے طرز پر اسلامی تاریخ لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ عزم مکمل نہ ہو سکا اور کتاب کی صرف ایک جلد مکمل ہو سکی۔

(۵) امام رازی

اس کتاب کے اندر امام رازی کے مفصل حالات اور ان کی تصانیف پر تبصرہ ان کے فلسفہ علم کلام اور نظریات و خیالات بیان کئے گئے ہیں اور ان پر تنقید و تبصرہ بھی ہے۔

(۶) حکمائے اسلام (دو جلدیں)

فلسفہ کی تمام شاخوں طبیعیات، الہٰیات منطق اور ریاضی وغیرہ میں مسلمان حکماء اور فلاسفر نے جو بڑے بڑے کارنامے انجام